اپنے اپنے پنجرے

موہن داس نیمشرائے

میرٹھ کی گلی گلی میں اپنی اپنی دکانوں دواخانوں کے بھیتر[1] (اندر) اور باہر دھات بند دوا بیچنے والے تتھا (اور) نامرد کو مرد بنانے والے حکیم بیٹھا کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ کے دواخانوں میں رکھے امام جستوں میں کٹے پستے دلّی تتھا لکھنؤ میں بیٹھے منتریوں کے حرموں میں پہنچائے جاتے تھے۔ ان حکیموں کا اکوت (بے حد، انگنت) دھن نہ بینکوں میں رکھا جاتا تھا نہ صندوق تجوریوں میں۔ وہ اپنا روپیا پیسا سونا چاندی یا تو دیواروں میں چنوا دیتے تھے یا پھر فرش میں گڑوا دیتے تھے۔ وہ حکیم عیار بھی تھے اور عیاش بھی۔ اپنی بنائی ہوئی دوا خود بھی چاٹتے اور انیہ زمینداروں، حاجیوں، نوابوں، نیتاؤں، سانسدوں، ودھایکوں، منتریوں، سنتریوں، کو بھی چٹاتے تھے۔ ان کے دواخانوں میں بھوگت (جو تہ خانے میں ہے) کمرے تھے جو کسی رنگ محل سے کم نہ ہوتے تھے۔

شہر کا بھوگول (ماحول) بدل رہا تھا۔ پر اتہاس ویسا ہی تھا۔ سنکری (تنگ) گلیوں میں دھنسے کچّے مکانوں پر سنسکرتی (تہذیب) کی چھاپ تھی۔ شہر میں انگنت بستیاں تھیں جن سے صبح شام گندھ (مہک) پھوٹتی تھی۔ اس گندھ کی الگ الگ پہچان ہوتی۔ مسلم بستیوں میں ادھکتر (زیادہ تر) سیخ کبابوں کی تیکھی مہک پھوٹتی۔ گوشت کی ڈیگیں، خمیری آٹے کی تندوری روٹیاں، حلیم بریانی۔ بھینس کا گوشت کٹوروں میں بھر بھر کر پردہ نشین گھروں میں پہنچتا۔ ہندو بستیوں میں صبح جلیبی کچوری بنائی جاتیں۔ شام کو بالوسائی (بالوشاہی) اور امرتی۔ پر ہماری بستیاں ننگی اور سپاٹ ہوتیں گندھیں (گندھ کا

[1] Where possible, high Hindi words have been glossed for Urdu readers.

مطلب، بو یا مہک، ہین کا مطلب، بغیر) پر عجیب سی درگندھ (بدبو) پرویش (ماحول) میں پھیلی ہوتی۔ گھر گھر میں چمڑا بھرا ہوتا آنگن میں چمڑے کے گیلے ٹکڑے سوکھنے کے لئے پڑے ہوتے۔ ایسی بستیوں کے آس پاس ہوا چلتی تو محسوس ہوتا، یہیں کہیں چماروا ڑا ہے۔

میرٹھ میں مراٹھے آئے اور مغل بھی۔ فرنگی اپنے ساتھ اپنی بھاشا، تتھا (اور)، سنسکرتی کا سموچا (پورا) لشکر لے کر آئے۔ جاتی (ذات) اور ورگوں (طبقوں) کے خانوں میں پہلے سے ہی بستیوں بنٹی تھیں۔ ہر آنے والے حملہ آور دستے نے انہیں الگ الگ نام دئے۔ بستیوں کے چپّے چپّے پر انہیں ناموں کی چھاپ تھی۔ کچھ بستیاں واڑوں اور پاڑوں کے نام سے جانی گئیں جتیواڑا، پوڈیواڑا، جوٹاڑا، چھیپیواڑا، کھٹیکواڑا، ٹھٹیرواڑا، بنیاپاڑا آدی آدی (وغیرہ، وغیرہ)۔ گلیوں پر بھی کہیں کہیں ویسی ہی چھاپ رہی۔ نیل کی گلی، پتّے والی گلی، روہتگی والی گلی، سنار گلی، کسائیوں والی گلی۔ میرے شہر کے بھیتر بنے پل تتھا پلیوں پر بھی جاتیوں کی پہچان تھی۔ لودوں والا پل، سینی پل،[2] کسائیوں کی پلیا، دھیوروں کا پل۔۔۔ اس سے الگ بیگم پل، بھمیا کا پل، تتھا خونی پل بھی تھا۔ شہر میں گیٹ اور دروازے بھی تھے۔ چار گیٹ، دلّی گیٹ، شوہراب گیٹ، کمبوہ گیٹ، بڑانا گیٹ اور سرائے بھی جیسے بنی سرائے۔

ہر جاتی اور ورگ کے لوگ اپنی اپنی پہچان میں سمٹے ہوئے۔ شہر دھڑکتا تھا، پر الگ الگ سور میں۔ بستیاں تھرکتی ناچتی تھیں الگ الگ بولیوں میں۔ ان سب سے مل کر بنا یہ شہر۔

ایسے شہر کی اُپج تھا میں جس کے مزاج میں گنوئی اور قصبائی دونوں انداز تھے۔ پھر بھی مجھے اپنا شہر بہت لبھاتا تھا۔ وشیش (خاص) طور پر شہر کے بیچو بیچ کھڑا گھنٹا گھر اور تھصیل پر پانی کی سپلائی کے

[2] لودوں والا ، سینی، وغیرہ، یہ بس جاتیون کے نام ہیں۔

لئے مظبوط لوہے کی چادر کی گلاس کے روپ میں بنی ٹنکی۔ یہ دونوں ہی شہر کی شان تھے۔ گھنٹاگھر شہر کو چوبیس گھنٹے سمے بتایا کرتا تھا۔ شہر میں لوگ گھڑی کم باندھتے تھے۔ گھنٹاگھر کے بارے میں یہ مشہور تھا جسے ہم کھیل کھیل میں ساموہک سور (ایک آواز) میں گاتے تھے :

گھنٹاگھر بھئی گھنٹاگھر

گھنٹاگھر میں چار گھڑی

جب گھنٹاگھر بجتا تھا

کھڑا مسافر ہنستا تھا

اور اس ٹنکی کے بارے میں بتایا جاتا تھا کہ وہ راون کا گلاس تھا جس میں وہ پانی پیتا تھا۔ میرٹھ راون کی سسرال بتائی جاتی تھی۔ جب جب وہ یہاں آتا تو اسی گلاس سے پانی پیتا تھا۔

میرے شہر کی عورتیں انیہ شہروں کی طرح ہی تھیں۔ نہ ادھک (زیادہ) خوبصورت اور نہ بدصورت۔ پر پردہ نشین عورتیں مجھے ادھک سندر لگتی تھیں۔ بھلے ہی کالے رنگ کی ہوں، بچپن سے جوانی تک میرے جیون میں کالے اور سانولے رنگ کی انگنت عورتیں آئی تھیں۔ کچھ نے مجھے گود میں کھلایا تھا تو کچھ نے مجھے پیار کیا تھا۔ ان میں پریمکائیں بھی تھیں اور ویشیائیں بھی۔ کچھ ان دونوں کے بیچ کی تھیں۔ جو نہ پریمکائیں بن سکی تھیں اور نہ ویشیائیں ہی۔ وہ آندھی کی طرح میرے جیون میں آئیں اور طوفان بن کر چلی گئیں۔

***

ہماری بستی کے کنارے پر جہاں سورنوں کی لکشمن ریکھا دلتوں کو الگ کرتی تھی بستی کے بیچ کی ریکھا کے اس پار ایک مندر تھا۔ مندر سورنوں کا تھا۔ مندر کا نام تھا پنچ مکھی۔ اس کے بھیتر بڑے بڑے آنگن پیڑپودوں کے ساتھ بغیچہ بھی تھا۔ ہم لوگوں کا مندر میں پرویش کرنا (اندر جانا) سورنوں کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ ہمارے جانے پر وہ ٹوکا ٹوکی کرتے تھے۔ بڑے بوڑھے اکثر ہماری جاتی کو لے کر گندی گندی گالیاں بھی دیا کرتے تھے۔ وہ بھرسک پریاس (پوری کوشش) کرتے تھے کے دلتوں میں سے کوئی ان کے مندر میں آ کر اسے بھرشٹ (ناپاک) نہ کرے۔ مندر کے پچھواڑے بنیے رہتے تھے۔ دائیں طرف بھی بنیوں کی ہی بستی تھی۔ ان میں آدھے براہمن تھے۔ ہماری بستی کے لوگوں سے ان کی بول چال نہ تھی۔ بول چال بھی کیسے ہوتی بھلا۔ وہ برہما کے مکھ سے پیدا ہوئے تھے ہم اس کی ٹانگوں سے۔ ہاں جب کبھی انہیں مزدوروں کی ضرورت ہوتی وہ ہمیں بلاوا بھجواتے تھے۔ تب بھی سویں (خود) اپنے پانووں سے چل کر نہیں آتے تھے۔ اپنے نوکروں میں سے کسی کو بھیجتے تھے۔ ہماری بستی سے گزرنا بھی انہیں سہاتا (بھلا لگنا) نہ تھا۔ بستی کے جب کسی ویکتی (شخص) سے باتیں کرتے تو ان کے ماتھے پر دو چار بل اوشیا (ضرور) ہی پڑے ہوتے تھے۔ بات کرنے کا انداز ان کا ایسا ہوتا جیسے ہم ان کے جڑخرید غلام ہوں۔ ابے تبے اور توتڑاک کے بنا تو وہ بات ہی نہ کرتے تھے۔ مندر بھی ان کی جڑ خرید سمپتّی (دولت) تھا جس کے ذرّے ذرّے پر ان کا اَدھکار (حق) تھا۔ ہماری بستی کے لوگ مندر کو آتے جاتے ہی دور سے دیکھ کر سنتوش کر لیا کرتے تھے۔

اکثر لوگ اچک اچک کر مندر کی بھیتری بناوٹ کو دیکھتے۔ مندر میں رکھیں دیوتاؤں کی مورتیوں کو دیکھتے۔ مندر کے چاروں اور چاردیواری تھی۔ کبھی کبھی جب مندر سنسان ہوتا تو وہ دیوار پر

بھی چڑھ جاتے تھے ۔ پھر من مسوس کر نیچے اتر آتے ۔ مندر اور سورنوں کے لئے ہم شودَر تھے ۔ اچھوت تھے ۔ دلت تھے پر انسان نہ تھے ۔ ہماری چھایا (سایہ) بھی ان کے لئے اپوتر (ناپاک) تھی ۔ ہم مندر میں گھس نہ جائیں شاید یہی سوچ کر مندر کی چار دیواری بنوائی گئی تھی۔ اسی چاردیواری کے بیچ میں دو دروازے تھے جو شام ہونے کے بعد بند کر دئے جاتے تھے ۔ سورن جاتی کے لوگ مندر کی سرکشا (حفاظت) کے ہر سمبھو پرَیاس (ممکن کوشش) کیا کرتے تھے۔ مندر کے ساتھ مندر کی سنسکرتی بھی انہیں وراثت میں ملی تھی۔

سال میں ایک بار ہی مندر کی پتائی (چونا) ہوتی تھی۔ پتائی پر مندر کی شکل صورت ہی بدل جاتی ۔ وہ سفید برّاق ہو اترانے لگتا ۔ اس کی برج، منڈیر، بھیتر اور باہر کی دیواریں سبھی سفیدی کی چادر اوڑھ لیتے ۔ رات میں مندر پر اور بھی نکھار آجاتا ۔ بجلی کے بلب کی روشنی میں مندر چمکنے لگتا ۔ پر جیسے ہی برسات آتی مندر کی دیواریں خراب ہونے لگتیں ۔ ان پر جگہ جگہ داغ بن جاتے ۔ بھیتر کی بدصورتی اور ابھر آتی ۔ پھر مندر اور اس کے آس پاس کا سموچا پریویش بھدرنگ (بدرنگ) ہو جاتا ۔ گندی دیواروں کو لوگوں کے دوارا اور ادھک گندہ کرنے کی مہم چھڑ جاتی۔ آتے جاتے لوگ ان پر تھوکنے سے باز نہ آتے۔ پان کی پیک کے نشان تو جگہ جگہ ہو جاتے ۔ لوگ کھڑے ہو کر موتےّ تو آدھے سے ادھک پیشاب سے دیوار ہی بھگوتے ۔ بچوں کو لئے مائیں جب ادھر سے گزرتیں، وہ بچے کی ناک سنک کر مندر کی دیوار سے ہی پونچھتیں ۔ مندر کی دیوار ان کے لئے رمال بن جاتا، کسی کے لئے پیشاب گھر۔ وہی مندر کبھی کبھی چکلا بھی بن جاتا، شراب گھر اور جوا گھر بھی۔ پر پھر بھی بہتوں کی آستھا (عبادت، یقین) تھی اس میں ۔ کچھ کو آشریہ (پناہ) بھی ملتا تھا۔

سڑک کے کنارے مندر کی ایک کوٹھری بھی بنی تھی۔ ورشا (بارش) سے بچنے کے لئے لوگ اکثر اس میں ہی چلے جاتے تھے۔ اسی کوٹھری میں سگریٹ بیڑی کے ٹوٹے بھرے ہوتے۔ کبھی کبھی خالی شراب کی بوتل بھی پڑی ملتی۔ صبح جمعدارنی بہار سکیرنے (جھاڑو لگانا، کوڑے لے جانا) آتی تو وہی بوتل اپنے سلوار (اپنی شلوار) میں اڑس لیتی اور تھوڑی دیر بعد ہی کلال کے یہاں جاکر دس پیسے میں بیچ آتی۔ دس پیسے کا مطلب گڑ چنے کھاکر ٹھنڈا پانی پی لو تو ایک وقت روٹی کھانے کی ضرورت نہیں۔ وہ اسی میں ترپت (سیر) ہو جاتی تھی۔

مندر کے دو دروازے تھے۔ ایک بڑا دروازہ دوسرا چھوٹا دروازہ۔ بڑے دروازے کے بالکل سامنے تیج سنھ سٹّے باز کا مکان تھا جو سٹا کھاتا تھا۔ اکثر لوگوں کے نمبر خالی ہی چلے جاتے تھے۔ اسی کے ساتھ والے مکان میں رادھے نام کا ویکتی بھی رہا کرتا تھا جو ہر سمے دارو پیئے رکھتا تھا۔ اس کا منہ بھی پان سے بھرا ہوتا تھا۔ خوب لمبی چوٹی رکھتا تھا۔ جوا بھی خوب کھیلتا تھا۔ جب کبھی اسکی جیب خالی ہو جاتی تب وہ مندر میں گھس جاتا اور سیدھے پجاری کے پاس جاکر پیسوں کی مانگ کرتا تھا۔ پجاری نے کبھی اسے نہ نہیں کہا تھا۔ ایک دو بار رادھے کو پیسے نہ دینے کی ہمت بھی کی۔ اگلے ہی پل اسے گالیاں سنّی پڑی تھیں وہیں دیوتاؤں کے مورتی کے سامنے۔ اور دیوتا بھی اس سمے نت مستک (سر جھکائے) ہو جاتے۔ پجاری وہیں سے کچھ رپیے اٹھاکر رادھے کو دے دیتا تھا۔ سنا تو یہ جاتا تھا کے رادھے پجاری کا رشتہ دار تھا۔

مندر میں چڑھاوا بھی خوب آتا تھا۔ اس کے دو کارن تھے۔ پہلے آس پاس اتنا بڑا مندر کوئی نہ تھا۔ بڑا مندر ہوگا تو بھکت (عبادت کرنے والے) بھی ادھک آئینگے۔ جیسے بڑی دکان پر

گراہک (گاہک) بھی زیادہ آتے ہیں۔ دوسرے دلتوں کو چھوڑ کر آس پاس دَھنوان (امیر، دولتمند) لوگ ادھک رہتے تھے۔ جن کے بڑے بڑے مکان تھے۔ ان میں سے ادھکانش (زیادہتر) کی سونے چاندی و کپڑے کی دکانیں تھیں۔ صبح سے شام تک روپے پیسے سے ہی گھرے ہوتے۔ آسامیوں کی سونے چاندی کی چیزیں گروی رکھ قرض دیا کرتے تھے۔ ان کی عورتیں مندر میں چڑھاوا بھی دونوں ہاتھوں سے دیتیں۔ یہ مندر رستوگیوں کا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مراٹھا سینا کا اسی جگہ پڑاو پڑا تھا۔ رستوگی تب ان کے رسوئیے (باورچی) ہوا کرتے تھے۔ پڑاو اٹھنے کے بعد مندر اور آس پاس کی جگہ مراٹھوں نے اپنے رسوئیوں یعنی رستوگیوں کو دے دی تھی۔ بعد میں انہوں نے یہاں مندر بنوا لیا تھا۔

شام کو جیسے ہی بنیئن بامنی تھالی لئے مندر میں پرویش کرتی تھیں ہم ان کے پیچھے پیچھے آرتی والے کمرے تک جا پہنچتے تھے۔ پر بھیتر جانا ہمارے لئے منع تھا۔ ہم پوجا کے کمرے سے باہر ہی ان کا انتظار کرتے تھے۔ ہماری گدھ درشٹی (باز جیسی نظر) بتاشے لڈّوں س،ے بھری تھالیوں کی اور ہی لگی رہتی تھی۔ جیسے ہی وہ باہر آتیں، ہمارے ہاتھ اٹھ جاتے۔ وہ کبھی بتاشے کبھی لڈّو کا چورا ہمیں دیتیں۔ کبھی کبھی ایک دو بتاشے گال میں رکھ ہم دوبارا سے مانگنے لگتے۔ تب میرا ساتھی میرے اسی پھولے گال پر گرٹنچو (ہاتھ کی مٹھی) مارتا۔ گال کے بھیتر کا بتاشا پھوٹ جاتا۔ کبھی کبھی اس کی رال باہر بھی نکل آتی تھی۔ ہم ایک دوسرے کو گالیاں دیتے۔ ہلاّ سن کر پجاری باہر آجاتا تھا۔ تب وہ ہمیں گھورتا۔ ہمارے کپڑے دیکھتا، ننگے پاؤں، بکھرے بال اور ان سب کے بیچ وہ ہماری جاتی کی پہچان جھٹ سے ڈھونڈھ لیتا۔

پجاری خوب سفید برّاق کپڑے پہنتا تھا۔ وہ دھوتی باندھتا تھا۔ اوپر سفید کرتا۔ پیروں میں

کھڑاؤں (خاص چپل) ۔ جب وہ چلتا تھا تو کھٹ کھٹ آوازیں ہوتی تھیں۔ اس کے منہ سے ادھکترجے شری رام جے شری رام نکلتا تھا۔ پوجا گھر میں جب وہ مورتی کے سامنے گاتا تھا تو آس پاس چار پانچ عورتیں اوشیہ ہوا کرتی تھیں۔ بیچ بیچ میں وہ گھنٹی بھی بجاتا تھا۔ کبھی کبھی پوجا گھر میں کوئی کتاّ گھس آتا۔ پجاری ڈنڈا لے اس کے پیچھے مارنے کو بھاگتا۔ پر اس سے پورو (پہلے) ہی کتاّ مٹھائی کا کوئی ٹکڑا یا پھل منہ میں دبا کر اڑنچھو ہو جاتا تھا۔ ایسے سمے پر پجاری مندر کے چوکیدار کو ڈانٹتا اور چوکیدار ہم پر غصہ اتارا کرتا تھا۔ جتنا چوکیدار ہمیں ڈانٹتا تھا اتنا ہی ہم اسے چڑاتے تھے۔ وہ ہمارے پیچھے بھاگتا۔ ہم چیختے چلاتے۔ مندر کے ساتھ والی کوٹھری میں تو ہماری آوازیں اور بھی گونجتی تھیں۔ جتنی تیز آوازیں گونجتی ہم اس سے ادھک تیز آواز گلے سے نکالتے تھے۔

اس مندر سے انگنت گھٹنائیں (واقعات) جڑی تھیں۔ درگھٹنائیں بھی۔ پر نہ مندر کی جواب دیہی (جواب دِہی) تھی اور نہ مندر والوں کی۔ مندر میں دیوتا جو واس کرتے (رہتے) تھے۔ اسلئے مندر میں سبھی کچھ معاف تھا۔ ایک بار مندر میں چوری ہو گئی۔ چوری کی رپٹ پولیس چوکی میں لکھ دی گئی پر چور نہ ملا۔ سردیوں کے دن تھے۔ مندر میں ایک لڑکی پکڑی گئی۔ پولیس چوکی میں ان دنوں کوئی اکھڑ (اجڈ، غیر مہذب، گنوار) جاٹ اِنسپکٹر تھا۔ اس کے ہاتھ میں جب ڈنڈا آ جاتا تھا تو کسی بھی جات کی اونچائی نیچائی ختم ہو جاتی تھی۔ اس دن بھی وہی ہوا۔ مندر کے پجاری کو دیوان جی پولیس چوکی لے آئے۔ دیوان جی بھی جاٹ تھے۔ پجاری کے ساتھ ایک آدمی بھی تھا اور وہ لڑکی بھی۔ وہ آدمی بھی پجاری تھا۔ کسی دوسرے شہر کے چھوٹے مندر میں۔ پولیس چوکی پر ہی اس عورت نے بتایا کے اسے بچہّ نہیں ہوتا تھا۔ وہ اسی مندر میں جاتی تھی جس میں وہ پجاری تھا۔ پہلے بھبھوت (راکھ) دیتا تھا پھر رات میں بلانے لگا۔ بعد میں ان کے بیچ جسمانی

سمبندھ ہو گئے۔ پھلسوروپ (نتیجتاً) اسے گربھ (پیٹ میں بچہ) رہ گیا۔ پر اسی بیچ اس کے پتی نے ڈاکٹر سے چیک اپ کرایا۔ وہ نپنسک (نامرد) تھا۔ اور اس کی بیبی (بیوی) کو بچہ ہونے والا تھا۔ بات ادھک نہ کھلے وہ دونوں بھاگ آئے۔ پوری کہانی سننے کے بعد انسپیکٹر کا ہاتھ اٹھ ہی گیا۔ اس پجاری نے بچایا تو اس پر بھی ڈنڈا چلا۔ پولیس چوکی میں اس دن بھیڑ ہو گئی تھی۔ سبھی بامن، بنیے لپکتے جھپکتے وہاں آ گئے تھے۔ آس پاس کی بستیوں میں بھی یہ خبر پہنچی۔ نزدیک کی بستی ٹھٹھیرواڑا میں بھی۔ وہاں پنڈت بنواری لال رہتے تھے جو نگر پالکا کے چیرمین تھے۔ دونوں پجاریوں کو پولیس چوکی سے لے آیا گیا تھا۔ پر اسی انسپیکٹر کا اگلے دن ٹرانسفر ہو گیا تھا۔ بامن پر ہاتھ اٹھایا یہ تو سراسر گھور (نہایت) انیایہ (ناانصافی) تھا۔ شاستروں میں تو اس کا کہیں الیکھ (ذکر) ہی نہ تھا پھر بامن کو کوئی بھی آدمی سزا کیسے دے سکتا تھا۔ اسے مارنا پیٹنا تو نشیدھ (منع) تھا۔ اس عورت کو اس کے شہر بھیج دیا گیا تھا۔ اصل میں ان دنوں اتر پردیش کے شکش (تعلیم) منتری بھی بامن تھے جو سوی میرٹھ کے تھے۔ بس انہونے ہی ہوم منسٹر کو فون کھڑکا دیا تھا۔

اس گھٹنا سے پہلے پولیس چوکی میں آئے چھوٹے موٹے اپرادھ (قصور) میں پھنسے لوگوں کو مندر میں لے جا کر قسم کھلائی جاتی تھی۔ بعد میں پولیس چوکی کے بھیتر ہی انسپیکٹر کے ڈنڈے کے سامنے ہی قسم کھلائی جانے لگی۔

ہماری بستی سے بھی کچھ عورتیں شام کو تھالی میں بتاشے، آٹے کا دیوا، تیل، باتی، چاول، لوٹے میں پانی لے کر پولیس چوکی کے پاس پیر پر ہی آتی تھیں۔ پیر سب کا تھا۔ وہاں اونچ نیچ، چھوٹے بڑے، غریب امیر، دلت سورن کا بھید نہ تھا۔ پیر پر نہ دروازے تھے اور نہ تالا۔ وہاں کچھ چوری ہونے کا ڈر بھی نہ تھا۔ تھالی میں عورتیں جلتا ہوا دیپک لاتی تھیں۔ ہوا سے دیوے کی

باتی نہ بجھے اسلئے وہ سر کا پلّو لمبا کر تھالی تک لے آتی تھیں۔ پر دھیرے سے ان کے پاس جا کر ہم ان کی تھالی میں رکھے دیوے کی باتی بجھا دیتے تھے۔

وہ ہمارے پیچھے بھاگتیں اور ہم خرگوش کی طرح چھلانگ لگا کر بہت دور نکل جاتے تھے۔ یوں پولیس چوکی سے سٹی ہوئی کوٹھری کو ہی پیر بنا دیا گ گیا تھا جہاں کسی کی مزار تھی۔ ہر روز اس مزار پر چار پانچ دیوے ضرور جلتے تھے۔ ان دیوں میں سرسوں کا تیل بھی بھرا ہوتا اور دیسی گھی بھی۔ موم بتّی ان دنوں نہ مندر میں جلتی تھیں نہ کسی مزار پر۔

مندر میں کل جمع تین لوگ تھے جنکے پیٹ مندر ہی پالتا تھا۔ نہ کیول ان کا بلکہ ان کے پروار کا بھی۔ چوکیدار کو چھوڑ کر پجاری اور مالی دونوں کے پروار مندر میں ہی رہتے تھے۔

***

مندر میں صبح شام بھیڑ ہوتی تھی۔ بھکتگن آتے تو آرتی بھی ہوتی۔ پر دوپہر کو مندر اکیلا پڑ جاتا تھا۔ وشیس (خاص) طور پر گرمیوں کی دوپہری میں تو اس کے بھیتر مرگھٹ جیسا سناّٹا ابھر آتا تھا۔ اس بھرے پورے دن میں ایک پتاّ بھی نہ کھڑکتا تھا۔ ایسے سمے پجاری پوجا گھر میں ہی لیٹا ہوتا تھا۔ وہاں اچھی خاصی ٹھنڈک ہوتی تھی۔ فرش تو خوب ٹھنڈا ہوتا۔ شام کو کچھ بوڑھے آتے اور اپنی اپنی ہانکتے۔ کوئی اپنے بیٹے کی برائی کرتا تو کوئی بہو کو کوستا۔ سبھی پچاس سال کے اوپر ہوتے۔ بار بار رامراج سے کلیگ کی تلنا کرتے۔ بوڑھوں کے لئے مندر چوپال تھی۔ کبھی کبھی آئیں جائیں

کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ پر ان بوڑھوں کے آس پاس ہم ذرا بھی شور کرتے، تو وہ فوراً ڈانٹ دیتے۔ پھر ہمارے ماں باپ کو کوسنے لگتے۔ ہم دور سے انہیں چڑاتے۔ بوڑھے آپس میں بتیاتے (بات کرتے تھے)۔ ایک کہتا:

"ارے چورسیا یہ کس کے بچّے ہیں؟"

"اور چورسیا جھٹ سے اتّر (جواب) دے دیتا۔ "سب سسرے چماروں کے ہیں"۔

"سب بھرسٹ کر کے رکھ دیا ہے انہون نے"۔ تیسرا بیچ میں بول اٹھتا۔ چوتھا جیسے انتظار میں ہوتا۔ وہ کہے بنا نہ چوکتا (ختم ہو جانا)۔ "ہاں شرما جی اب تو کہیں بھی دھرم کرم نئی رہا"۔ شیش (باقی) دو تین بوڑھے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتے۔ ان میں سب سے ادھک عمر کا بوڑھا انت (آخر) میں بولتا۔ "ہاں بھیا اب انہیں آزادی جو مل گئی ہے۔ مہارے زمانے میں اتنا کھلاپن نہ تھا"۔

شام کو آرتی ہونے کے بعد پجاری مندر کے آنگن میں آکر پرساد بانٹتا تھا۔ کبھی بتاشے تو کبھی موتی چور کے لڈّو۔ لڈّو کہاں چورا ہوتا تھا۔ اس سمے آس پاس کی بستیوں کے بچّے اکٹھے ہو جاتے تھے۔ سب آنگن کی لمبی بنی چوتری پر بیٹھ جاتے تے۔ پجاری تھالی میں بھر کر پرساد لاتا تھا۔ پر وہ ہمیشہ اوپر ہاتھ کر پرساد دیا کرتا تھا جس سے اس کا ہاتھ ہم سے چھو نہ جائے۔ پرنامسروپ پرساد زمین پر گر جاتا تھا جسے ہمیں اٹھانا ہی پڑتا تھا۔ نہ اٹھائیں تو اگلے دن سے پرساد ملنا بند۔ ایک دن پرساد دیتے ہوئے پجاری کی انگلیاں میرے ہاتھ سے چھو گئی۔ بس پجاری کا پارا چڑھ گیا۔ ناراض ہوتے ہوئے وہ جھلاّیا (چلایا)۔ "تو چمار کا ہے نہ۔ سب کچھ بھرسٹ کر (بگاڑ) دیا۔ کتنی بار کہا تم ڈھوروں سے پرساد دور سے لیا کرو"۔

میں سن کر سن رہ گیا تھا۔ میرے ساتھ بچپن کا دوست نورنگ بھی تھا۔ ہم دونوں پجاری کو گھورنے لگے تھے۔ مندر ویسے ہی چپ تھا۔ مندر کے کونے کونے سے جیسے ہمارے لئے گالیاں آ رہی تھیں۔ ہم بھی کیا کرتے۔ ہمارا تو کوئی مندر نہ تھا۔ سارے مندر سورنوں کے تھے۔ وہ ہی پجاری تھے اور وہ ہی چوکیدار۔ میرے بھیتر جوالا مکھی اگ آیا تھا جس نے مجھے جھجھوڑ (جھنجوڑ) کر رکھ دیا تھا۔ میں نے آویش میں (آپ سے باہر ہوکر) وہیں پرساد پجاری کے سامنے تھوک دیا تھا۔

"تھو تمہارا مندر اور تمہارا پرساد" کہہ کر میں چلا آیا تھا۔ اس دن کے بعد میں مندر نہیں گیا تھا۔ مندر مجھ سے میلوں دور ہو گیا تھا جیسے۔ مندر کے بھیتر رکھے پتتھر کے دیوتاؤں کے پرتی (سے، کو لے کر، کی طرف) نفرت سی ہو گئی تھی۔ شاید یہیں سے میرے بھیتر کوئی ناستک (دہریہ) پرش (آدمی) آ کر بیٹھ گیا تھا۔ بعد کے دنوں میں یہ نفرت اور اناستھا اور بڑھی تھی۔ جیسے کمہار مٹی کے برتن بنا کر انہیں آگ پر سینک کر مضبوط بناتا ہے ویسے ہی مندر کے پرتی میرے من میں رچی بسی گرنتھیاں (گانٹھ، گرہ) سمے کی آنچ میں اور مضبوط ہوئی تھیں۔

ان دنوں گھنٹوں گھنٹوں مائیں بچوں کو دودھ پلاتی تھیں اور بچہ ایک طرف کی چھاتی کا دودھ پیتا اور دوسری چھاتی کو گیند سمجھ کر کھیلتا تھا۔ ادھر مائیں بچے کے سر میں جوئیں ڈھونڈتیں ادھر بچہ گود میں لیٹ کر دودھ پیتا۔ یہ سب ایک نشچت سمے تک ہی ہوتا تھا۔ بچّے کی ٹانگیں جب لمبی ہو پیٹ کے نیچے تک پہنچنے لگتیں تب ماں اسے اپنا دودھ پلانا بند کر دیتی تھی۔ بچّا ادھک ضد نیم کا تیل ستنوں (چھاتیوں) پر لگا لیتی تھیں۔ بچّے کو دودھ سے روکنے کا یہ آسان اور سستا اپایہ (طریقہ) تھا جسے لگ بھگ ہر ماں استعمال کرتی تھی۔ کیوں کہ بعد تک چھاتیوں میں دودھ آتا بھی نہیں

تھا۔ میرا بھی دودھ چھڑانے کے لئے چار پانچ بار تائی ماں نے یہی اپایہ کیا تھا۔ میں بار بار ماں کی چھاتی کو ہونٹ لگاتا اور کڑوا منہ ہونے پر دوبارہ چھاتی کو منہ میں نہ لیتا تھا۔ ماں کی چھاتیاں میرے لئے نیم کا پیڑ بن جاتیں جس کے ہر سروت (پانی کی لہر) سے کڑواہٹ پھوٹتی۔

میری عمر چھ سات ورش (سال) ہو گئی تھی۔ تب جا کر گھروالوں کو ہوش آیا کے مجھے اِسکول میں ڈالنا چاہئے۔ ان دنوں ویسے بھی چھ سال کی عمر سے پہلے سکول بھیجنے کا رواج نہ تھا۔ بچّہ جب تک گھوڑے کی طرح خوب سرپٹ بھاگنے دوڑنے نہ لگ جائے، دو چار کا سر نہ پھوڑ دے، اپنی اچھل کود سے ماں باپ کی ناک میں دم نہ کر دے تب تک وہ اپنے اپنے بچّے کو دودھ پیتا بچّہ ہی سمجھتے تھے۔ بچّے کا دودھ چھڑانا اور اسکولوں میں بھیجنا دونوں کاریہ (کام) لگ بھگ ایک ہی ساتھ ہوتے تھے۔

مجھے بھی چھہ ورش کے بعد اسکول میں داخل کرایا گیا تھا۔ اڈمشن فارم پر پتا والے کالم میں پتا کا نام ہی لکھوایا تھا۔ حالانکہ میرا اڈمشن پتا نے نہیں بلکہ با نے ہی کرایا تھا۔ اس دن تائی ماں نے پیر پر ایک پیسے کے بتاشے چڑھائے تھے۔ اسکول ہماری بستی میں ہی تھا۔ اسکول کا نام بیسک پرائیمری پاٹھشالا تھا۔ اس کی بلڈنگ دو منزلی (منزلہ) تھی پر ہم نیچے کمرے میں ہی بیٹھتے تھے۔ بیٹھنے کے لئے کرسیاں نہ تھیں۔ ٹاٹ کی پٹیاں (ٹکڑے) ہوتی تھیں جن پر پنکتوار (قطاروں میں) ہم بیٹھتے تھے۔ اوپر کی منزل پر دوسری سے پانچویں تک ککشائیں (کلاسیں) چلتی تھیں۔ ککشا ایک سے پانچ تک سبھی ٹاٹ پر ہی بیٹھتے تھے۔ ککشا ایک کے لئے بنا جلد کی آٹھ دس پرشٹھوں (صحفوں) کی پستک (کتاب) ہوتی تھی جسے بیسک کہا جاتا تھا۔ اس میں ہندی اکشر گیاں (لکھنے کی جانکاری) کے ساتھ پہاڑے، ڈیوڑھا سویا آدی (ضرب دینا، وغیرہ) ہوا کرتے تھے۔

اس کے علاوہ ایک تختی اور قلم دوات۔ ساتھ ہی سیلکھڑی (سلیٹ)۔ کپڑے کے تھیلے میں یہ سب ڈال کر ہم اسکول آتے تھے۔

ہمارے اسکول کو باہر کے لوگ اکثر چماروں کا اسکول کہا کرتے تھے۔ جیسے چماروں کا کنواں، چماروں کا نل، چماروں کا نیم، چماروں کی گلی، چماروں کی پنچایت آدی آدی، ویسے ہی اسکول کے ساتھ جڑی تھی ہماری جات۔ جات پہلے آتی تھی، اسکول بعد میں۔ یہی کارن تھا کے اس اسکول میں کبھی کبھی گنتی کے پورے ادھیاپک (ٹیچر) نہ ہوئے تھے۔ دو دو اور کبھی کبھی تین تین ککشائوں کو ایک ایک ادھیاپک ہی سمبھالتا تھا۔ بچّے بھیڑ بکری کی طرح کمروں میں بھرے ہوتے تھے۔ ادھیاپک لمبی چھٹّی پر رہتے تھے یا پھر دوسرے اسکول میں کسی نہ کسی طرح ٹرانسفر کرا لیتے تھے۔ صحیح بات تو یہ تھی کہ ہمارے اسکول میں سورن جاتی کا کوئی ادھیاپک آنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس کے سیدھے سیدھے دو کارن تھے۔ پہلا یہ کہ اسکول چماروں کی بستی میں تھا، دوسرا اس میں سبھی چماروں کے بچّے پڑھتے تھے۔ جو ادھیاپک آ بھی جاتے تھے وہ ناک بھونہ سکوڑکر (آبرو چڑھاکر) پڑھایا کرتے تھے۔ ہماری ہی بستی میں ہماری جات کے نام پر گالیاں دے بیٹھتے اور ہم سب سنتے تھے۔

اسکول میں نہ نل تھا، نہ ہی ٹائیلٹ اور نہ کھیل کا میداں۔ نیچے سے ہی اوپر پانی پہنچانا پڑتا تھا۔ پانی چڑھانے کی ذِمہ داری بڑے بچوں کو نبھانی پڑتی تھی۔ یہ کاریہ بالٹیوں سے ہوتا تھا۔ پانی کی بالٹی کو دو دوتین تین بچّے پکڑکر لے جاتے تھے۔ اس میں سے کافی پانی تو اوپر پہنچتے پہنچتے چھلک چھلک کر بکھر جاتا تھا۔ پانی کی ضرورت تختی دھونے کے لئے پڑتی تھی۔ جب کبھی میں اوپر کے کمرے میں ہوتا اور تیزی کے ساتھ پیشاب لگتا تو میں باہر چھجّے پر چلا جاتا تھا اور وہیں سے

نیچے پیشاب کر دیتا تھا۔ نیچے آبچک تھی جہاں لوگ کھڑے ہوکر پیشاب کرتے تھے۔ کبھی کبھی ان کے اوپر ہی پیشاب پڑ جاتا۔ جلدی میں ہڑبڑاتے ہوئے (پریشان ہوتے ہوئے) اتنے وہ ناڑا باندھ کر باہر آکر شور مچاتے تب تک میں بچوں کے بیچ چپکے سے جا کر بیٹھ جاتا۔ اور اپنے بستے میں سے کتاب نکال کر اس پر آنکھیں گڑا کر پڑھنے لگتا۔ "پیشاب کرنا بھی سکھاتے ہو"۔ نیچے سے کوئی چلاّتا پر آواز کسی کو سنائی پڑتی کسی کو نہیں۔ وہ آواز سامنے کرسی پر بیٹھے ماسٹر کو سنائی نہ دے، اس کے لئے ہم اور بھی شور کرنے لگتے تھے۔ کچھ دیر میں سڑک پر سے چلاّنے والا ویکتی جل بھن کر چلا جاتا تھا۔

اسکول میں بجلی بھی نہ تھی۔ گرمیوں میں ہمیں خوب گرمی اور سردیوں میں خوب سردی لگتی تھی۔ لے دے کر بستی میں ایک یہی تو اسکول تھا۔ بستی والوں کو سنتوش (اطمینان) تھا۔ اسکول کیسا بھی تھا آخر اسکول تھا۔ اس سمے دلتوں کی بستی میں اسکول ہونا بھی بڑی بات تھی۔ لوگ اسکول کو شکشا کا سورج مانتے تھے۔ بستی میں جیسے جیسے سورج اگیگا بڑھیگا ویسے ویسے اشکشا کے ساتھ کریتیاں تتھا کپر تھائیں (بدتمیزی) دور ہونگی۔ بستی کے لوگ اپنے بچوں کو پڑھانے لکھانے میں رچی (دلچسپی) لینے لگے تھے۔ پر لڑکیوں کو اسکول میں نہ بھیجا جاتا تھا۔ ان کا اسکول بھیجنا خراب مانا جاتا تھا۔ وہ گھر پر ہی رہتی تھیں اور اپنی ماؤں، چاچیوں، بھابھیوں کے ساتھ گھر کے کام کراتی تھیں۔ پوتڑے دھونے سے بچوں کو گود میں اٹھائے اٹھائے کھلانے کا کاریہ ادھکتر انہیں سونپا جاتا تھا۔

اسکول میں پڑھنے والے سبھی بچوں کے یوں نام ہوتے تھے لیکن سورن جاتی کے ماسٹر انہیں ان کے نام سے نہیں پکار کر انٹ شنٹ (نامناسب) ناموں سے بلایا کرتے تھے۔ کسی

بچّے کی اگر ناک بہتی ہو تو اسے ریٹل پھیپھل کہہ کر پکارا جاتا۔ کوئی موٹا ہوا تو اسے موٹو، کسی کے سر پر بال نہ ہوئے تو گنجا، یا گنجے، آنکھ خراب ہونے پر کانا، یا کانے، ٹانگ خراب ہونے پر لنگڑا، یا لنگڑے آدی کے روپ میں سمبودھن کیا (کہا) جاتا تھا۔ ابے تبے کے بنا تو ماسٹر بات ہی نہ کرتے تھے۔ یہی نہیں ماں باپ کے نام سے بھی ادھکتر بچوں کو بلایا جاتا تھا۔ ماں باپ کے بھی بگڑے ہوئے نام تھے۔ جیسے ابے او سلڑ کے، ابے او کلڑکے، ابے او ڈویا کے، ابے او ہپڑو کے، ابے او پھرکنی کے، ابے او چٹنی کے، ابے و گھرسل کے، ابے و تاڑکا کے آدی آدی۔ کسی بچّے کا نام ڈھول رکھ دیا جاتا تو کسی کا چول۔ انہیں گھوڑا، گدھا، خچرّ، کتّا، بلائو (بلی)، الوّ نام سے پکارنا تو عام بات ہوتی۔

پر یہ نام بگاڑ کر سمبودھن کرنے والے بھارتیہ (ہندوستانی) سنسکرتی کے سنواہک (چلانے والے) ہوتے اور آریہ سبھیتا (تہذیب) کے پوشک (پالنے والے)۔ وہ کہتے کچھ اور کرتے کچھ۔ صبح بچوں کو پڑھاتے: ہمیں اہنسا (امن، نہ مارنا) میں وشواس (یقین) رکھنا چاہیئے، کسی کو برا یا کڑوا نہیں بولنا چاہیئے اور تھوڑی دیر بعد ہی لات، گھونسے، تھپڑ تتھا ڈنڈوں سے بچوں کی دھنائی (پٹائی) بھی کر ڈالتے۔ انہیں نہ جانے کیا کیا بولتے۔ دوپہر ہونے سے پہلے بچوں کو سمتا، برابری کا پاٹھ (سبق) پڑھاتے اور دوپہر بعد جب انہیں پیاس لگتی تو چپکے سے اپنا گلاس نکال کر نل پر جا کر پانی پی آتے۔ بچوں کے لئے پانی ہے یا نہیں، اس کی چنتا انہیں نہیں ہوتی تھی۔

آدھی چھٹّی میں سبھی بچّے اپنے اپنے گھر کی اور دوڑ پڑتے۔ انکی مائیں روٹی، سبزی، چٹنی،

پیاز، ہری مرچ، گڑ کے ساتھ ان کا انتظار کرتی تھیں۔ جیسا بھی جس کے گھر میں کھانے کو ہوتا، جھٹپٹ پیٹ میں ڈال لیا جاتا۔ میں گلی میں گھستے ہی تائی ماں سے سب سے پہلے سوال کرتا:

"کیا بنایا ہے؟"

تائی ماں تو بیٹھی ہوتی ہی میرے انتظار میں۔ وہ جھٹ سے سبزی کا نام بتا دیتی۔ ہمارے گھر آلو اور مسور کی دال ادھک بنتے تھے۔ کبھی کبھی گوشت بھی بنتا تھا۔ تائی ماں گوشت کو گوس کہتی تھی۔ روٹی کھاتے ہوئے میں تائی سے باتیں بھی کرتا رہتا تھا۔ اس بیچ اسکول کی گھنٹی بج اٹھتی۔ با دکان میں ہوتا۔ اس کے کانوں میں گھنٹی کی آواز پڑتی تو مجھے سناتے ہوئے کہہ اٹھتا:

"موندا س، روٹی کھاکر جلدی اسکول جا۔"

میں پانی پی کر اسکول کی اور دوڑ پڑتا۔ اسکول میں دیری (دیر) سے جانے والے بچوں کی پٹائی ہوتی تھی۔